مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی

امام فراہیؒ اور علم تفسیر — پانچ امتیازی خصوصیات

امام فراہیؒ کے معاصرین نے جس فیاضی اور جس دریادلی کے ساتھ انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ کسی بھی صاحب علم سے مخفی نہ ہوگا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی طویل عبارتیں امام فراہی کی عظمت اور ان کی جلالت قدر کی وہ ترجمانی نہیں کرتیں جو علامہ سید سلیمان ندوی کا یہ ایک جملہ کرتا ہے، فرماتے ہیں:

"وکان رحمہ اللہ آیۃ من آیات اللہ۔"[1]

"مرحوم اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔"

اس شخص کی عظمتوں کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے جس کو مبدأ فیاض نے اپنے خزانۂ خاص سے کچھ ایسی عظمتیں عطا کی تھیں جو بجا طور پر انھیں اس امت کے ائمۂ عظام کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں۔

ہم اس مختصر سی گفتگو میں امام فراہیؒ کی انھیں عظمتوں یا انھیں خصوصیات پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

پہلی خصوصیت

امام فراہیؒ کی سب سے بڑی خصوصیت جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے

---

[1] الامعان فی اقسام القرآن، تالیف الشیخ المعلم عبد الحمید الفراہیؒ (ترجمۃ المؤلف) طبع ثانی دار القرآن، الکویت سنہ ۱۴۰۰ھ ۱۹۸۰ء ص ۴

کہ صحیح معنوں میں وہ قرآن پاک سے بہرہ اندوز ہوئے تھے، قرآنی علوم و معارف، یا قرآنی انوار و تجلیات میں سے انھیں اتنا وافر حصہ ملتا تھا کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ اس کی ایک ایک آیت بلکہ لفظ لفظ پر انھوں نے ٹھہر کر غور کیا تھا اور اسے اپنے قلب و نگاہ میں سمو لینے کی کوشش کی تھی۔ اپنے عمیق مطالعہ اور طویل فکری سفر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ قرآن اپنے معنی و مدلول میں بالکل واضح، دو ٹوک اور قطعی ہے۔ خود قرآنی تصریحات سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو جگہ جگہ نور سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:

قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین [1]	آگیا تمھارے پاس اللہ کے یہاں سے نور اور آگئی روشن کتاب۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

و أنزلنا الیکم نورًا مبینًا [2]	اور ہم نے اتارا ہے تمھاری طرف واضح نور۔

ظاہر ہے کہ وہ کتاب جو سرتاسر نور ہو، وہ نہ صرف یہ کہ خود واضح اور روشن ہوگی بلکہ جو چیز بھی اس کے سامنے رکھی جائے گی اسے واضح اور روشن کر دے گی۔ اسی طرح قرآن پاک کو بُرہان اور کتاب مبین کہا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا ایہا الناس قد جاءکم برھان من ربکم [3]	اے لوگو! آگیا تمھارے پاس تمھارے رب کے یہاں سے بُرہان۔"

اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

حٰمٓ والکتاب المبین [4]	حٰمٓ، شاہد ہے کتاب مبین۔

بُرہان کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو بالکل کھلی ہوئی اور بیّن ہو، جو بالکل دو ٹوک اور دو دو چار کی طرح بالکل واضح ہو۔ جس پر غموض اور التباس کی کوئی پرچھائیں نہ ہو۔

---

[1] سورۂ مائدہ۔ ۱۵، [2] سورۂ نساء۔ ۱۷۴
[3] سورۂ نساء۔ ۱۷۴ [4] سورۂ زخرف۔ ۱ و دخان۔ ۱

کتاب مبین کا مفہوم بھی اسی سے ملتا جلتا اور اسی سے قریب تر ہے۔ یعنی بالکل واضح اور روشن۔

کتاب الٰہی کی یہی صفت ہے جس کی بنا پر اسے حکم کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ بدعات و خرافات کے درمیان حق کی شاہراہ واضح کرے اور تمام اختلافات و انحرافات میں وہ ایک قول فیصل کی حیثیت سے سامنے آئے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین وانزل معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فی ما اختلفوا فیہ۔ [1]	لوگ پہلے ایک ہی امت تھے، پھر وہ مختلف راہوں پر پڑ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے کہ وہ ماننے والوں کو بشارت دیں اور نہ ماننے والوں کو خطرے سے آگاہ کر دیں، اور ان کے ساتھ اس نے کتاب اُتاری جو حق پر مشتمل تھی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے ان باتوں میں جن میں انھوں نے اختلاف کیا ہے۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقًا لما بین یدیہ من الکتاب ومھیمنا علیہ فاحکم بینھم بما أنزل اللہ۔ [2]	اور ہم نے تمھاری طرف کتاب اُتاری حق کے ساتھ جو اس کتاب کی پیشین گوئیوں کے مطابق ہے جو اس سے پہلے آچکی ہے اور جو اس پر مہیمن ہے تو تم ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے نازل فرمایا ہے۔

پھر قرآن پاک کی یہی صفات ہیں جن کی بنا پر اسے مہیمن کہا گیا اور اسے پچھلی تعلیمات اور پچھلی کتابوں کے لیے ایک معیار اور ایک کسوٹی کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کتاب جو سرتاسر نور ہو، جو کتاب مبین ہو، جو بُرہان ہو، جو

---

[1] سورۃ البقرہ۔ ۲۱۳، [2] سورہ مائدہ۔ ۴۸

حکم اور مہیمن ہو، کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنے قوانین و احکام اور اپنی تعلیمات میں بالکل واضح اور دوٹوک نہ ہو؟

یہی وجہ ہے کہ امام فراہیؒ بار بار اس پر زور دیتے ہیں کہ پورا قرآن قطعی الدلالۃ ہے اور اپنے معانی و مفاہیم کے لحاظ سے وہ بالکل مستقل اور خود مکتفی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

"پورا قرآن قطعی الدلالۃ ہے اور اس کے اندر بہت سے معانی کا احتمال نتیجہ ہوتا ہے علم اور تدبر کی کمی کا۔"[1]

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"میرے خیال میں اس پیچیدہ اور جان لیوا مرض کا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ قرآن کو مضبوطی سے پکڑا جائے، اور تمام رایوں اور ساری روایتوں کو کتاب اللہ کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ اور یہ ممکن نہیں جب تک کہ ہمارا یہ ایمان نہ ہو کہ کسی قرآنی آیت کی بس ایک ہی تاویل ہو سکتی ہے۔"

اور میں یہ پہلے واضح کر چکا ہوں کہ قرآن قطعی الدلالۃ ہے اور اس کی عبارتوں کا بس ایک ہی مفہوم ہوا کرتا ہے۔"[2]

ایک اور مقام پر وہ فرماتے ہیں:

"اور یہ بدترین فتنہ ہے جس سے یہ امت دوچار ہوئی ہے۔ چنانچہ ہر فرقے نے کچھ آیات کو لے لیا اور بقیہ آیات کی طرح طرح کی تاویلیں کرنے لگا، یہاں تک کہ کفر اور زندقے تک بات پہونچ گئی، لہٰذا اس مصیبت سے نجات پانے کی بس ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ قرآن کے ساتھ جو بہت ساری رائیں اور بہت ساری روایتیں جوڑ دی گئی ہیں ان سے اسے بالاتر سمجھا جائے۔ پس قرآن کو قطعی اور اس کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں ان کو ظنی سمجھو اور ان کے اندر اختلاف کی گنجائش رکھو،

---

[1] مقدمہ تفسیر نظام القرآن ص ۱۶

[2] التکمیل فی اصول التاویل ص ۲۰

اور ان کے سلسلے میں زیادہ بحث مباحثہ نہ کرو۔"[1]

اسی طرح ایک اور مقام پر وہ فرماتے ہیں:

"لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انھوں نے قرآن کو غیر قطعی سمجھ لیا۔ اس طرح اس سے تو وہ مایوس ہو گئے، اور ان عقلی و منطقی دلائل کے چکر میں پڑ گئے جن کے گھاٹ پر پانی پینے والا ہمیشہ پیاسا ہی رہتا ہے۔ اس طرح ہم نزاع و اختلاف کے ایسے منجدھار میں پھنس گئے، جس سے ایک طویل زمانے سے ہمیں نکلنا نصیب نہ ہوا۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم پھر سے اس چیز کی طرف پلٹیں جس سے ہم پہلے بدگمان ہو گئے تھے۔ ضروری ہے کہ اب ہم اس سے اچھی امیدیں وابستہ کریں اور یہ ایمان رکھیں کہ قرآن اپنی دلالت میں بالکل قطعی ہے اور بالکل دوٹوک فیصلے دینے والا ہے۔"[2]

ان عبارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام فراہیؒ کو اپنے اس فکر پر کتنا گہرا یقین تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس ایک بات سے قرآن کا مقام کہیں سے کہیں جا پہونچا ہے اور اب اس کی حیثیت علم و استدلال کی دنیا میں ایک مہیمن، ایک قولِ فیصل اور ایک واجب الاتباع حکم کی ہو جاتی ہے۔ جب کہ اس سے پہلے اس کی حیثیت یہ تھی کہ وہ خود اپنے مفہوم میں غیر واضح اور اپنی تفسیر و تاویل کے لیے کسی دوسری چیز کا محتاج تھا۔

قرآن میں محکمات و متشابہات کے سلسلہ میں اختلاف آرا کے نتیجے میں بھی قرآن کی عظمت و قطعیت بُری طرح مجروح ہوئی۔ ہمارے بعض علما کا طرزِ عمل اس مسئلے میں بھی کچھ عجیب سا رہا، ایک آیت اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے لیکن اگر وہ کسی کے عقیدہ و مسلک کے خلاف پڑی تو اس نے کہہ دیا کہ یہ آیت متشابہ ہے۔ اس طرح ایک ہی آیت کسی کے نزدیک متشابہ ہوتی ہے اور کسی دوسرے کے نزدیک وہ محکم ہوتی ہے۔ امام رازیؒ اس صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تم یہ جان لو کہ یہ ایک بہت ہی اہم مقام ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ اصحابِ مذاہب میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ ہے کہ جو آیتیں اس کے مسلک کے موافق ہیں وہی محکمات

---

[1] التکمیل فی اصول التاویل ص ۲۲۔ [2] ایضاً ص ۲۴

ہیں اور جو آیتیں اس کے مخالف کے مسلک کی ہیں وہ متشابہات میں سے ہیں۔
چنانچہ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ ارشادِ الٰہی:

فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔	جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کی راہ اختیار کرے۔

محکمات میں سے ہے۔ اور دوسرا ارشادِ الٰہی:

وما تشاءون إلاّ أن یشاء اللہ رب العالمین	اور تم نہیں چاہ سکتے الا یہ کہ اللہ چاہے جو سارے جہان والوں کا رب ہے۔

یہ متشابہات میں سے ہے۔ اور جو سُنّی حضرات ہیں وہ اس کے بالکل برعکس کہتے ہیں۔"

پھر آگے وہ مزید فرماتے ہیں:

"یہ جان لو کہ تم دنیا میں مسلمانوں کا جو گروہ بھی پاؤ گے اس کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے مسلک کے موافق آیات کو محکمات میں شمار کرے گا اور جو آیتیں اس کے مخالف کے مسلک کی ہوں گی انھیں وہ متشابہات میں شمار کرے گا۔"[1]

پھر آگے وہ مزید فرماتے ہیں:

"جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جمہور امت کا ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ جو آیت ان کے مسلک کے موافق ہوگی وہ محکمات میں سے ہوگی اور جو آیت ان کے خلاف ہوگی وہ متشابہات میں سے ہوگی۔"[2]

امام فراہیؒ اس صورت حال پر بھی گہرے افسوس کا اظہار کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں "یہ کتنی تکلیف دہ بات ہے کہ ایک ہی آیت ایک فرقے کے نزدیک محکمات میں سے ہو، اور وہی آیت دوسرے کے نزدیک متشابہات میں سے ہو۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب تک محکمات اور متشابہات کا مسئلہ واضح نہ ہو فتنے کا دروازہ بند نہیں ہو سکتا۔

وہ اس طرزِ فکر کی شدت سے تردید کرتے ہیں جس کی طرف امام رازی نے اشارہ

---

[1] مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر) للرازی ۴/۱۸۸، [2] ایضاً ۴/۱۸۹

فرمایا ہے، اور محکمات و متشابہات کی ایسی تشریح کرتے ہیں کہ اس سے قرآن کی قطعیت وعظمت پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

چنانچہ ان کا خیال ہے کہ متشابہات کا تعلق ماورائے عقل سے ہے یا امور آخرت سے ہے اور ان کی کنہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ آخرت میں پیش آنے والے معاملات کس کس طرح پیش آئیں گے یہ جاننا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ راسخین فی العلم کا شیوہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی کرید میں پڑنے کے بجائے ان کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہیں۔

یہ متشابہ آیات اس لیے ہوتی ہیں کہ ان پر ایمان لایا جائے۔ جہاں تک ان کی کنہ جاننے کا تعلق ہے تو اس کی نہ ہمیں کوئی ضرورت ہے اور نہ اس تک پہونچنا ہمارے لیے ممکن ہے۔ کیونکہ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔

اس طرح امام فراہیؒ کے نزدیک متشابہ آیات کی حقیقت یا کنہ تک پہونچنا تو ممکن نہیں ہوتا البتہ جہاں تک ان کے اجمالی مفہوم کا تعلق ہے تو اس میں کوئی التباس نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اس اجمالی مفہوم میں بالکل واضح ہوتی ہیں۔ اور وہاں بھی قرآن کے نور مبین اور کتاب مبین ہونے کی شان پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔

دوسری خصوصیت

امام فراہیؒ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے قرآن پاک کو تمام علوم شرعیہ کی اصل اور ان کا محور قرار دیا۔ ان کی تمنا یہ تھی کہ قرآن پاک کی مثال ایک آفتاب کی ہو اور تمام علوم دینیہ اور شرعیہ کی حیثیت اس کے نظام شمسی کی ہو اور یہ پورا نظام شمسی ہمیشہ اسی آفتاب عالم تاب کے گرد گردش کرتا ہوا نظر آئے۔ وہ ہمیشہ اسی سے وابستہ ہو اور اسی سے اکتساب نور کر رہا ہو۔ چنانچہ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

فان جعلت القرآن اصلاً لتمام علم الدین کما ھو فی الحقیقۃ صار من الواجب	اگر تم قرآن کو تمام علوم دینیہ کی اصل قرار دیتے ہو جیسا کہ حقیقت میں وہ ہے بھی تو ضروری ہو جاتا ہے کہ باقاعدہ

أن تؤسس أصول للتاويل بحيث تكون علماً عاماً لكل ما يؤخذ من القرآن"۔ ۱؎	تاویل کے اصول وضع کیے جائیں تاکہ قرآن پاک سے جو کچھ بھی اخذ کیا جائے اس کے لیے وہ عام روشنی کا کام دے سکیں۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ وہ فرماتے ہیں:

"یہ بات محتاج بیان نہیں کہ دین کا زیادہ تر تعلق نفوس کے تزکیہ، عقول کی تربیت اور اعمال کی اصلاح سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا تعلق اخلاق، عقائد اور شرائع سے ہے اور قرآن ان تمام امور میں بہتر سے بہتر رہنمائی دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔" ۲؎

پھر وہ امت کی بدمذاقی اور اس سلسلے میں قرآن سے بے اعتنائی پر افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جہاں تک علم الاخلاق کا تعلق ہے تو اس کے سلسلے میں لوگوں نے بڑی وسیع المشربی سے کام لیا حتیٰ کہ ہر وہ چیز جو انھیں پسند آگئی اور ان کے دل کو بھا گئی اس کو انھوں نے دانتوں سے پکڑ لیا، چنانچہ کچھ لوگوں نے تو اس کی بنیاد حکمت عملی پر رکھی جو فلاسفہ سے انھوں نے سیکھی تھی۔

کچھ لوگوں نے اس کی بنیاد اپنے تجربات پر رکھی۔

کچھ لوگوں نے اس کی بنیاد ضعیف روایات پر رکھی۔

اور کبھی کبھی وہ قرآن پاک سے بھی کچھ لے لیتے ہیں اس کا لحاظ کیے بغیر کہ اس کی انھوں نے جو تاویل اختیار کی ہے وہ کتنی رکیک ہے اور ایسا اس وجہ سے ہوا کہ انھیں یہ غلط فہمی ہو گئی کہ ترغیب و ترہیب یا کسی اچھائی کی مدح یا برائی کی مذمت کے لیے صحت استدلال ضروری نہیں۔

۱؎ التکمیل ص ۳

اسی طرح صوفیاء کے ایک طبقے نے عقائد کے سلسلے میں لب کشائی کی اور چونکہ وہ عربی زبان سے ناواقف اور اس دین حنیف کی حقیقت سے ناآشنا تھے اس لیے انھوں نے قرآن کی تفسیر اپنے وہم و گمان کی روشنی میں کی اور اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ قرآن اور اس کے اسرار کا علم انھیں کے پاس ہے۔ اس کی مثالیں تمھیں ابن عربی کے کلام میں ملیں گی۔

اور رہا علم کلام تو اس کی صورت یہ رہی ہے کہ چونکہ ہمارے متکلمین کو سابقہ دہریوں سے رہا اس لیے انھوں نے کتاب و سنت پر اعتماد کم کیا اور زیادہ تر ان باتوں سے استدلال کیا جو عقل کو اپیل کر سکیں تاکہ فریق مخالف انھیں تسلیم کر لے اور بارہا ایسا بھی ہوا کہ انھوں نے مخالف کے اعتراضات سے بچنے کے لیے قرآن کی ایسی تاویل کی جو اس کے منشاء کے خلاف تھی۔

اور چونکہ وہ صحیح تاویل تک نہ پہونچ سکے اور عقل و نقل میں تطبیق نہ دے سکے اس لیے انھوں نے تاویل کے لیے کچھ ایسے چور دروازے بھی نکال لیے کہ جب وہ صحیح طور سے دفاع نہ کر سکیں تو ان سے نکل کر بھاگ سکیں یہاں تک کہ ان میں سے بعض لوگ مثلاً امام رازی جن کی لغزشوں سے اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے یہ تک کہہ گزرے کہ ظاہر قرآن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہو سکتا ہے وہ متشابہات میں سے ہو۔ اس طرح انھوں نے پورے قرآن ہی کو غیر واضح اور بے اعتبار بنا دیا۔" ۱؎

امام فراہیؒ کی اس تحریر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ چیز بالکل ہی ناقابل فہم تھی کہ دین سے تعلق رکھنے والے علوم میں کتاب الٰہی سے غافل ہو کر ایک قدم بھی آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

اور یہ چیز محض ایک عقیدہ، ایک نظریہ اور ایک تمنا کی حد تک نہ تھی بلکہ عملاً وہ اس

۱؎ التکمیل ص ۴

میدان میں آگے بڑھے اور نہایت کامیابی کے ساتھ یہ ثابت کر دیا کہ قرآن ان تمام معاملات میں کتنی بہتر رہنمائی کرتا ہے۔

انھوں نے علمی طور پر یہ ثابت کیا کہ قرآن کا استدلال نہایت محکم اور دلکش ہوتا ہے، وہ بہت جلد فطرت کو اپیل کرتا اور قلب و ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ اس کے برعکس متکلمین کے دلائل فریق مخالف کو خاموش تو کر سکتے ہیں مگر وہ فطرت کو اپیل کرنے اور قلب و ذہن کو متاثر کرنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہوتے ہیں۔

لہٰذا ملحدین کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے بھی ہمیں قرآن پاک سے ہی رہنمائی حاصل کرنی چاہیے کہ اس صورت میں ہماری کامیابی کے امکانات زیادہ قوی اور روشن ہوں گے۔

اسی طرح امام فراہیؒ نے 'القائد الی عیون العقائد' کے نام سے ایک شاہکار تصنیف تیار کی جس میں عقیدے سے متعلق مختلف اہم موضوعات پر قرآن کی روشنی میں گفتگو کی اور بہت سے اہم مسائل جن میں لوگ زبردست اختلاف کا شکار تھے اور جو در اصل نتیجہ تھا قرآنی ہدایات اور قرآنی تعلیمات پر کما حقہ، غور نہ کرنے کا۔ ان تمام اہم مسائل کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ قرآن کی روشنی میں حل کیا اور ان کے سلسلے میں واضح طور پر قرآنی نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ اسی طرح اپنی کتاب 'فی ملکوت اللہ'، میں علم الاخلاق سے متعلق بہت سے پیچیدہ اور اہم مباحث پر قرآن کی روشنی میں گفتگو کی اور یہ بتایا کہ اسلام میں گناہ کی کیا حقیقت ہے۔ دنیا میں جو مصائب و آلام پیش آتے ہیں ان کی کیا حقیقت ہے، نفوس کی تربیت کے کیا اسلامی علوم ہیں، کوئی قوم یا کوئی امت خلافت کی عزت سے کب سرفراز کی جاتی ہے اور کیا چیزیں ہوتی ہیں جو کسی امت کو خلافت کی عزت سے محروم کر دیتی ہیں۔ خلیفہ کے کیا اوصاف ہوا کرتے ہیں اور خلافت کی عمارت کن اصولوں پر استوار ہوتی ہے۔

اس طرح کے بہت سے پیچیدہ اور اہم مسائل اس کتاب میں زیر بحث آئے ہیں، اور امام فراہیؒ نے قرآن کی روشنی میں ان تمام مسائل پر نہایت بصیرت افروز گفتگو کی ہے جس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ قرآن ان تمام مسائل میں بہتر سے بہتر طور پر رہنمائی کی صلاحیت

رکھتا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے ہم اس بات کے قطعاً محتاج نہیں ہیں کہ اغیار کی کاسہ لیسی کریں اور اس طرح خود سے اپنے لیے ذلتوں اور نامرادیوں کو دعوت دیں۔

پھر جو نقطۂ نظر تمام علوم دینیہ و شرعیہ کے سلسلے میں امام فراہیؒ کا تھا بعینہٖ وہی نقطۂ نظر احادیث و روایات کے سلسلے میں بھی تھا۔ وہ جس طرح تمام علوم دینیہ و شرعیہ کو قرآن کے تابع دیکھنا چاہتے تھے اسی طرح احادیث کو بھی اسی مرکز سے وابستہ اور اسی کا تابع دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

"احادیث میں سے وہی چیزیں قبول کرو جو قرآن کی تائید کریں نہ کہ وہ جو اس کے نظام کو درہم برہم کر دیں۔"[1]

اپنی تفسیر نظام القرآن میں جس طریقے کو انھوں نے ملحوظ رکھا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میں یہ یقین رکھنے کے باوجود کہ صحیح حدیثیں کبھی قرآن کے مخالف نہیں ہوسکتیں۔ پہلے آیات کی تفسیر آیات کی روشنی میں کرتا ہوں اور احادیث کا ذکر تابع کی حیثیت سے کرتا ہوں۔"[2]

ایک دوسری جگہ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ رسول خدا وہ بات فرمائیں جو قرآن کے خلاف ہو۔ لہٰذا میں کبھی کسی ایسے شخص کی تصدیق نہیں کرسکتا جو رسول خدا کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کرتا ہو جو قرآن کے خلاف ہو۔"[3]

ایک اور مقام پر وہ فرماتے ہیں:

"کتنی ہی روایتیں ہیں جو بظاہر قرآن کے خلاف معلوم ہوتی ہیں۔ مگر قرآن کی روشنی میں ان کی تاویل کی جائے تو وہ بالکل قرآن کے مطابق ہوجاتی

---

[1] فاتحہ نظام القرآن (عربی)، ص ٩، [2] ایضاً ص ٧

[3] تفسیری حواشی (مخطوط) مقدمہ ص ١

ہیں۔ کیونکہ قرآن کی حیثیت ایک مرکز کی ہے اور تمام حدیثیں مختلف جہتوں
سے اسی کی طرف لوٹتی ہیں۔ اس کی تفصیل تم ہماری کتاب 'احکام الاصول
باحکام الرسول' میں پاؤ گے۔" [1]

اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ امام فراہیؒ کی یہ تمنا اور یہ کوشش تھی کہ قرآن
ہی بزم علم وحکمت کا صدر نشین ہو، اس کی حیثیت امام اور قائد کی ہو، اور دوسرے تمام
علوم اس کے تابع اور معاون ہوں۔

تیسری خصوصیت

امام فراہیؒ کی تیسری خصوصیت جو انھیں مفسّرین میں ایک ممتاز درجہ عطا کرتی ہے
یہ ہے کہ انھوں نے امت کے لیے قرآن فہمی کی راہ ہموار کی۔

اس میں شبہ نہیں کہ تفسیر قرآن کے سلسلے میں دیگر مفسّرین کی گراں قدر خدمات ہیں،
اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان تفاسیر سے قرآن پاک کے سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے نیز قرآنی
مشکلات کے حل کرنے میں وہ معاون ہوتی ہیں مگر ایسا نہیں ہوتا کہ ان سے خود قاری کے
ذہن کی تربیت ہو اور اس کے اندر اس بات کا ملکہ پیدا ہوا کہ وہ خود سے قرآنی مشکلات
پر غور کر سکے، اس کی گتھیوں کو سلجھا سکے اور اس کے اندر علوم واسرار کا جو خزانۂ بے پایاں
اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھا ہے اس کا وہ سراغ لگا سکے۔

مولانا فراہیؒ کی تفسیر نظام القرآن کا یہ خاص وصف ہے کہ اس سے قرآن مجید پر
غور کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ صاحب تفہیم القرآن علامہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ امام فراہیؒ
کی اس خصوصیت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"علامہ فراہیؒ ایک بڑے درجے کے محقق تھے انھوں نے اپنی
تفسیروں میں تحقیق کا ایک خاص مجتہدانہ اسلوب اختیار کیا ہے جو دوسرے

[1] التکمیل فی اصول التاویل ص ۲۱

مفسّرین کے اسالیب سے بہت کچھ مختلف ہے۔
ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ناظر کے زاویۂ نظر
کو وسیع کرتا ہے اور قرآن مجید کے معانی ومطالب سمجھنے کے لیے تحقیق وتفحص
اور موادِ علمی کے وسیع تر میدانوں کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔" [1]

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

"سلسلۂ تفاسیر فراہیؒ کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ اس کے جس
جزء کو بھی پڑھیں گے وہ آپ کو صرف اسی سورہ کے معنی ومطلب سے آشنا
نہ کرے گا جس کی تفسیر اس جزء میں کی گئی ہو بلکہ اس کے ساتھ ہی پورے
قرآن کو سمجھنے کے لیے آپ کو بہت سی اصولی معلومات بھی دے گا، تحقیق کے
نئے راستے دکھائے گا۔ تدبر فی القرآن کے نئے نئے دروازے کھولے گا۔" [2]

یہ امام فراہیؒ کے کام کا بڑا ہی اہم پہلو ہے جس کی طرف مولانا مودودیؒ نے توجہ دلائی
ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اچھی طرح اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

عام مفسّرین کرام نے تفسیریں لکھیں اور اس سے ان کا مقصد یہی تھا کہ قرآن کے جو
مشکل مقامات ہیں ان کی وضاحت کر دیں یا جو مبہم حقائق ہیں ان کی تشریح کر دیں، تاکہ سرسری
طور پر کوئی قرآن کو پڑھنا یا سمجھنا چاہے تو اسے زیادہ دشواری نہ پیش آئے۔ لیکن جہاں تک
امام فراہیؒ کا تعلق ہے تو اصلاً ان کے پیش نظر یہ نہ تھا کہ وہ قرآن کی کوئی نئی تفسیر لکھ ڈالیں۔
بلکہ ان کی تمنا یہ تھی کہ وہ لوگوں کے لیے فہم قرآن کی راہ ہموار کر دیں تاکہ وہ براہ راست قرآن
کو سمجھنے کی کوشش کریں اور خود اس کی پہنائیوں میں اُترنے کے عادی ہو جائیں۔ چنانچہ
اس سلسلے میں ان کے پیش نظر کام کا جو خاکہ تھا اسے اجمالی طور پر بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"اس کے بعد خود قرآن سے قرآنی حقائق ومعارف کے ربط کو سمجھنے کی
راہ ہموار ہو جائے گی اور یہ مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ

[1] ترجمان القرآن ۸/۱، [2] ایضاً ج ۱۹، عدد ۴،۵،۶

ربط ہماری کتاب 'نظام القرآن' سے معلوم کیا جائے۔ کیونکہ غور و فکر اور استنباط کی راہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے اس سے دل کو روشنی اور ذہن کو جلا حاصل ہوتا ہے۔ لیکن مجھے کون لا کے دے گا کوئی ایسا شخص جو غور و فکر اور بحث و تحقیق کا خوگر ہو اور جو علوم و معارف کو ان کے اصل سرچشموں سے اخذ کرنے کے لیے اپنی ساری قوت نچوڑ دیتا ہو۔"[۱]

اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے ہر کتاب اپنی جگہ پر اس لحاظ سے بہت ہی اہم ہے کہ وہ قاری کے اندر قرآن فہمی کے ذوق کی آبیاری کرتی اور اس بحرِ علم و حکمت میں غوّاصی کا سلیقہ سکھاتی ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے جو کتابیں لکھیں ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) فاتحہ تفسیر نظام القرآن (۲) مفردات القرآن (۳) دلائل النظام (۴) تاریخ القرآن (۵) التکمیل فی اصول التاویل (۶) اسالیب القرآن (۷) کتاب الحکمۃ (۸) حجج القرآن (۹) القائد الی عیون العقائد (۱۰) فی ملکوت اللہ (۱۱) الامعان فی اقسام القرآن (۱۲) جمہرۃ البلاغۃ (۱۳) الرأی الصحیح فیمن ہو الذبیح۔

یہ تیرہ[۱۳] کتابیں ہیں جو امام فراہیؒ نے بطور مقدمہ تفسیر کے لکھیں۔ ان کتابوں میں انھوں نے اپنے فکر کے مختلف گوشے اُجاگر کیے اور ان رہنما اصولوں کی وضاحت کی جو ایک قاری کے لیے قرآن فہمی کی منزل کو بہت قریب کر دیتے اور اسے آیات کی تہ تک پہونچ جانے کا ملکہ عطا کرتے ہیں۔

اس طرح اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ علماء قرآن اور ائمہ تفسیر کے درمیان وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے فہم قرآن اور تفسیر قرآن کا اتنا واضح، اتنا جامع، اتنا مکمل، اتنا مدلل اور اتنا بلند تصوّر پیش کیا۔ اور نہ صرف فکری اور نظری طور پر وہ تصوّر پیش کیا بلکہ نہایت

---

[۱] مفردات القرآن ص ۱

کامیابی کے ساتھ اسے عملاً برت کر دکھا بھی دیا۔

یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں سے بہتر سے بہتر طور پر قرآنی ذوق کی نشو و نما ہوتی اور خالص قرآنی نہج پر ذہن کی تربیت ہوتی ہے۔

چوتھی خصوصیت

امام فراہیؒ کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے نظم قرآن کا ایک جامع اور مکمل تصوّر پیش کیا۔ نظم قرآن کا تصور کوئی نیا تصوّر نہیں ہے، مفسّرین کی ایک جماعت شروع سے اس تصوّر کی حامی اور مؤید رہی ہے۔

ان میں اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جنھوں نے اپنی تفسیروں میں عملاً اس کو برتنے کی کوشش بھی کی ہے۔ امام بقاعیؒ کی تو پوری تفسیر ہی جو بیس[۲۰] ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اسی فکر کے گرد گردش کرتی اور اس پہلو سے قرآن کے اعجاز کو ثابت کرتی ہے۔

بلاشبہ اس سلسلے میں متعدد ائمہ تفسیر کی کوششیں حد درجہ قابلِ ستائش ہیں اور امام بقاعیؒ نے نظم الدرر فی تناسب الأیات والسور کی شکل میں جو زبردست کارنامہ انجام دیا ہے وہ تو انتہائی حیرت ناک ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے یہاں قدم قدم پر تکلّف کا احساس ہوتا ہے۔ جس سے بسا اوقات خود اس علم سے ہی بیزاری یا مایوسی پیدا ہونے لگتی ہے۔ جیسا کہ امام شوکانی کی اس شرر بار تنقید سے واضح ہے جو انھوں نے امام بقاعیؒ کی تفسیر پر اپنی تفسیر 'فتح القدیر' میں کی ہے۔

امام فراہیؒ کا معاملہ اس سلسلہ میں بالکل واضح ہے۔ ان کے سامنے منزل بھی متعیّن ہے اور نشانات راہ بھی پوری طرح واضح اور روشن ہیں۔ اس وجہ سے قاری کو ان کے یہاں تکلّف کا گمان نہیں ہوتا بلکہ ایک زبردست علمی جلال اور ایک بے پناہ علمی وقار نظر آتا ہے جو غیر شعوری طور پر انسان کو متاثر کرتا اور اسے کلام الٰہی کی عظمتوں کے آگے لاکر جھکا دیتا ہے۔

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے نشانات راہ ہیں جو نظم قرآن کی جستجو میں امام فراہیؒ کے پیش نظر رہتے ہیں۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ خود فرماتے ہیں:

ایک اور مقام پر وہ فرماتے ہیں:

"مزید برآں مجھے یہ امید ہے کہ نظمِ قرآن پر غور کرنے سے اربابِ عقل پر قرآن کی حکمتیں روشن ہوں گی۔ کیونکہ آیات کے مابین نظم کرنے والی چیز وہی حکمتیں ہوا کرتی ہیں۔ ان کی حیثیت بالکل وہی ہوا کرتی ہے جو کسی ہار کے لیے لڑی کی ہوتی ہے۔" [1]

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"نظم ہی وہ مضبوط رسی ہے کہ جو اسے مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے اس کو وہ انحراف سے محفوظ رکھتی ہے اور یہ وہ روشن چراغ ہے جو حکمتوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ کیونکہ آیات کے مابین ربط قائم ہوتا ہے ان ہی حکمتوں سے جو ان کے اندر پوشیدہ ہوتی ہیں۔ وہی ان کے درمیان رابطے کا کام کرتی ہیں۔" [2]

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام فراہیؒ کے نزدیک نظم اس کا نام نہیں ہے کہ دو چیزوں یا دو باتوں کے درمیان کسی بھی قسم کا کوئی تعلق ظاہر کر دیا جائے خواہ وہ کتنا ہی کمزور اور دور کا تعلق ہو۔ اس کے برعکس ان کے نزدیک نظم نام ہے اس رشتے یا اس مناسبت کو دریافت کرنے کا جو بہت سی حکمتوں کی کلید ہو، اور جس کے نتیجے میں وہ بہت سارے اسرارِ حقیقت بے نقاب ہوتے ہوں جو اس رشتے یا اس مناسبت کے مخفی رہنے کی صورت میں کبھی بے نقاب نہیں ہو سکتے تھے۔

گویا امام فراہیؒ کے نزدیک نظم بجائے خود کوئی مطلوب شے نہیں اگر وہ قرآنی حکمتوں سے مالا مال نہ کرے۔ اس کی ساری اہمیت اور عظمت کا راز یہی ہے کہ وہ قرآنی معارف کی کلید اور قرآنی حقائق کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ لہٰذا تلاشِ نظم کی کوئی بھی ایسی کوشش جو اس مقصد تک نہ پہونچائے وہ ایک ناکام کوشش ہے جس کا کوئی حاصل نہیں۔

---

[1] تفسیری حواشی ص ۱

[2] التکمیل فی اصول التاویل ص ۱۳

"ہر نظام اس قابل نہیں ہوتا کہ اسے اختیار کر لیا جائے بلکہ صرف وہی نظام قابلِ قبول ہوگا جس میں تاویل کی خوب صورتی پائی جائے۔ کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بودی اور رکیک تاویل سے بھی کلام کے اندر نظم قائم ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں غلط اور بے بنیاد باتوں کے لیے دروازہ کھل جاتا ہے، اور اس صحیح اور بلند نظام کی راہ بند ہو جاتی ہے جو کلامِ الٰہی کی عظمت کے شایانِ شان ہوتا ہے۔" [1]

جن لوگوں نے نظمِ قرآن پر کام کیا ہے بالعموم ان کا انداز یہ رہا ہے کہ آیات کی جو تاویل عام طور سے رائج رہی ہے اسی تاویل پر اعتماد کر کے انھوں نے آیات کے درمیان نظم تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب اگر وہ تاویل غلط رہی تو اس صورت میں صحیح نظم تک پہونچنا ان کے لیے کیونکر ممکن ہو سکتا تھا؟ اور جب صحیح نظم تک پہونچنا ان کے لیے ممکن نہ ہوا تو اس میں انھوں نے بے جا تکلّف سے کام لیا اور کلام و منطق کے زور سے اسے زبردستی ثابت کرنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں وہ تفسیریں نظمِ قرآن کی جنت نگاہ بننے کے بجائے کلام و منطق کی رزم گاہ بن کر رہ گئیں۔

امام فراہیؒ کے یہاں نظم کے لیے تاویل کی خوب صورتی پہلی شرط ہے۔ وہ صحیح اور خوب صورت تاویل پر ہی نظمِ قرآن کی بنا رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں نظمِ قرآن کا بلند علمی معیار ملتا ہے۔

دوسری چیز جو بطور نشانِ راہ امام فراہیؒ کے پیشِ نظر رہی ہے وہ یہ ہے کہ نظام حکمت کی کلید ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مختلف احکام کے درمیان جو مناسبتیں ہوتی ہیں ان پر غور و فکر نہ صرف یہ کہ تمھیں نظمِ کلام سے واقف کرے گا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تم پر بہت سی حکمتوں کے دروازے بھی کھولے گا۔ کیونکہ نظام کبھی بھی حکمت سے خالی یا اس سے جدا نہیں ہو سکتا۔" [2]

---

[1] دلائل النظام ص ۲۶ ، [2] ایضاً ص ۲۹

تیسری چیز جو بطور نشان راہ امام فراہیؒ کے پیش نظر رہی ہے وہ یہ ہے کہ کسی سورہ کا عمود یا اس کا مرکزی مضمون ہی اس کے نظام کی کلید ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا جب تک اس سورہ کا عمود واضح نہ ہو اس وقت تک یہ اطمینان نہیں کیا جا سکتا کہ اس سورہ کی آیات کا نظم واضح ہو گیا۔ چنانچہ ایک مقام پر وہ فرماتے ہیں:

"یہ یاد رہے کہ سورہ کے عمود کی تعیین ہی اس کے نظام کی کلید ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہ بہت ہی مشکل علم ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کی مماثل اور اس کے آس پاس کی سورتوں پر بار بار غور کیا جائے۔ یہاں تک کہ اس سورہ کا عمود سپیدۂ صبح کی طرح روشن ہو جائے کہ اس سے پوری سورہ روشنی میں آجائے گی اور اس کا نظام بالکل واضح ہو جائے گا۔ ہر آیت کا خاص محل متعین ہو جائے گا اور مختلف تاویلات میں سے جو راجح تاویل ہوگی وہ سامنے آجائے گی۔"[1]

ایک دوسرے مقام پر وہ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ جان لو کہ نظام سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہر سورہ کا ایک خاص تشخص ہو، کیونکہ سورہ کے مضامین جب ایک دوسرے سے بالکل مربوط ہوں گے اور وہ تمام مضامین ایک ہی مرکزی نقطے کی طرف بڑھ رہے ہوں گے اور کلام میں وحدت کا رنگ نمایاں ہو جائے گا تو اس صورت میں وہ سورہ اپنے مستقل تشخص کے ساتھ سامنے آجائے گی اور جب تم آیات پر اس انداز سے نظر ڈالو گے تو اس وقت ان کا جمال و استحکام اور ان کی آب و تاب تمھارے سامنے آئے گی۔"[2]

گویا امام فراہیؒ کے نزدیک نظم آیات کو سمجھنے کا پیمانہ یہ نہیں ہے کہ دو آیتوں یا دو مضامین کے اندر کسی قسم کا تعلق تلاش کر لیا جائے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس پوری سورہ کا کوئی ایک مرکزی مضمون یا کوئی ایک مرکزی نقطہ متعین کیا جائے اور پھر سورہ کے تمام مضامین میں اس

---

[1] دلائل النظام ص ۷۷، [2] ایضاً ص ۷۵

طرح سے ربط قائم کیا جائے کہ ان تمام مضامین کا رُخ اس ایک ہی مرکزی مضمون کی طرف ہو جائے۔ گویا اس پوری سورہ میں کثرت مضامین کے باوجود وحدت کی شان نمایاں ہو جائے اور وہ سورہ اپنے کامل تشخص کے ساتھ سامنے آجائے۔

چوتھی چیز جو بطور نشان راہ امام فراہیؒ کے سامنے رہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نظم جو قریبی اور متصل آیات میں ربط قائم کر دے اور دور کی آیات کو جو ان آیات سے پہلے اور بعد میں آئی ہیں بالکل کاٹ کر رکھ دے وہ صحیح نظم نہیں۔ صحیح نظم کی شان یہ ہے کہ وہ دور و نزدیک کی تمام ہی آیات کو اس طرح باہم مربوط کر دے کہ ان کے درمیان کسی قسم کی بے ربطی کا گمان نہ ہو۔

پانچویں اور چھٹی چیز جو امام فراہیؒ کے سامنے رہی ہے وہ بالترتیب یہ ہے کہ وہ نظم جس کے لیے عبارت میں کوئی دلیل یا قرینہ موجود ہو وہ اس نظم کے مقابلے میں قابل ترجیح ہوگا جس کے پیچھے کوئی دلیل یا قرینہ نہ ہو۔

اسی طرح وہ نظم جو کتاب و سنت کے محکمات سے ہم آہنگ ہو وہ اس نظم کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ہوگا جو اس وصف سے خالی ہو۔[1]

بنیادی طور پر یہ چھ نشانات راہ ہیں جو نظم قرآن کے طویل اور صبر آزما سفر میں امام فراہیؒ کے پیش نظر رہے ہیں اور یہ نشانات ایسے ہیں کہ کوئی بھی صاحب نظر انھیں دیکھ کر بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ اس سفر کے لیے کتنے اہم اور ناگزیر ہیں۔

امام فراہیؒ چونکہ ان سے کبھی غافل نہیں ہوئے اس لیے ان کی سمت سفر ہمیشہ صحیح رہتی ہے اور منزل تک پہونچنے میں انھیں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

پانچویں خصوصیت

علماء کا یہ کہنا ہے کہ کسی کو قرآن پاک کی تفسیر کرنی ہو تو سب سے پہلے اسے قرآن پاک

---

[1] دلائل النظام ص ۶۸

کی ہی طرف رجوع کرنا چاہیے کیونکہ کسی آیت کی سب سے اچھی تفسیر وہی ہے جو کسی آیت کی ہی روشنی میں کی گئی ہو۔[1]

عام طور سے تفسیر قرآن بالقرآن کا جو مفہوم سمجھا گیا ہے اور جو تفسیر کی کتابوں میں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن پاک میں ایک بات کہیں اجمال کے ساتھ آتی ہے کہیں تفصیل کے ساتھ، کہیں اختصار کے ساتھ آتی ہے کہیں وضاحت کے ساتھ، کہیں مطلق انداز میں آتی ہے اور کہیں اس میں کوئی قید لگی ہوئی ہوتی ہے۔ کہیں وہ عموم کے ساتھ آتی ہے اور کہیں اس کی تخصیص ہو جاتی ہے۔

لہٰذا وہ ساری آیات جو ایک موضوع سے تعلق رکھتی ہیں وہ سامنے رکھی جائیں اس طرح اجمال والی آیات کو تبیین والی آیات سے، عموم والی آیات کو تخصیص والی آیات سے، اطلاق والی آیات کو تقیید والی آیات سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

قرآن پاک کی کچھ آیات ہوتی ہیں جو کسی حکم شریعت پر مشتمل ہوتی ہیں، کچھ عرصے بعد دوسری آیات آتی ہیں جو پچھلی آیات اور پچھلے حکم کی ناسخ ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان دونوں طرح کی آیات کو سامنے رکھ کر ان آیات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

ایک موضوع ایک جگہ نہایت اختصار کے ساتھ بیان ہوتا ہے دوسری جگہ قدرے تفصیل سے۔ تو ایک جگہ کی تفصیل سے دوسری جگہ کے اختصار کو سمجھا جائے۔

ایک ہی واقعہ قرآن پاک میں متعدد جگہوں پر بیان ہوتا ہے۔ کہیں واقعے کا کوئی حصہ بیان ہوتا ہے کہیں کوئی اور حصہ، تیسری جگہ کوئی اور حصہ تو ان تمام جگہوں کو یکجا کر کے واقعے کی مکمل تصویر دیکھنے کی کوشش کی جائے۔

عام طور پر تفاسیر سے، تفسیر قرآن بالقرآن کا اسی طرح کا مفہوم سامنے آتا ہے۔ بلاشبہ یہ مفہوم اپنی جگہ صحیح ہے۔ لیکن اس میں جو چیز قابلِ غور ہے وہ یہ کہ اس مفہوم کی رو سے پورے قرآن کی تو درکنار نصف قرآن کی بھی تفسیر اس اصول پر ممکن نہیں۔

---

[1] البرہان فی علوم القرآن، ۲/۱۷۵، الاتقان ۲/۲۲۵

عملی یا واقعاتی طور پر اس دعوے کی صحت کا اندازہ کرنے کے لیے ہم علامہ محمد امین شنقیطی کی گراں قدر تفسیر 'اضواء البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن' کو سامنے رکھ سکتے ہیں۔ علامہ موصوف نے متذکرہ بالا اصول پر تفسیر قرآن لکھنے کا فیصلہ کیا مگر اس کا جو انداز رہا وہ یہ کہ ترتیب وار تمام آیات پر وہ گفتگو نہ کر سکے۔ بلکہ بیچ بیچ میں بہت ساری آیات کو قلم انداز کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ مثال کے طور پر سورۂ آل عمران کی تفسیر لکھنی ہوئی تو انھوں نے ابتدا کی مکمل چھ آیات چھوڑ کر ساتویں آیت کے آخر "وما یعلم تاویلہ الا اللہ" کی تاویل سے تفسیر سورہ کا آغاز کیا۔ پھر چودھویں آیت "زین للناس حب الشہوات ... الخ" کے صرف ایک لفظ (الانعام) پر گفتگو کر کے وہ اکتیسویں آیت "قل ان کنتم تحبون اللہ ... الخ" پر پہونچ گئے۔

یہ چند مثالیں ہوئیں، انھیں مثالوں پر پوری تفسیر کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

پھر یہ اسی تفسیر کی بات نہیں اس انداز پر جو بھی تفسیر لکھی گئی اس کی یہی کیفیت ہے۔ یہ تفسیریں پورے قرآن کی نہیں بلکہ قرآن کے بس ایک حصے کی تفسیر کرتی ہیں۔ اس کے بعد ان کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے۔

اس کے بالمقابل امام فراہیؒ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو قرآن کا کوئی ایسا حصہ نہیں رہتا جو اس اصول کی دستِ رس سے باہر ہو۔ اس لیے کہ نظم قرآن بھی قرآن کا ہی ایک جز ہے، اس سے علیٰحدہ کوئی چیز نہیں۔ لہٰذا اس کی روشنی میں جو تفسیر ہوگی وہ بھی تفسیر قرآن بالقرآن کے ہی تحت آئے گی۔

اس طرح امام فراہیؒ محض اپنے وسیع تر نظریۂ نظم قرآن کی بدولت ان تمام جگہوں پر تفسیر قرآن بالقرآن کے اصول پر کاربند نظر آتے ہیں جہاں عام طور پر دشواریاں پیش آتی ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ فیل کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سابق سورہ یعنی سورۂ ھمزہ میں ایک عیب جو اور اشارہ باز کا ذکر ہے جو اپنے انجام سے غافل اور مال و جاہ کی لذتوں میں سرمست ہے۔ اسے خبر دی گئی ہے کہ وہ تباہ ہو کے رہے گا اور اپنے تمام سامان عیش کے ساتھ

خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ اور چور چور کر دینے والی جہنم میں پڑے گا۔

اس سورہ میں بطور ایک تاریخی شہادت کے ان لوگوں کی تباہی کا واقعہ بیان ہوا ہے جو قوت کے گھمنڈ اور دولت کے نشے میں اللہ تعالیٰ کے مقدس گھر پر چڑھ دوڑے اور اس کے قہر و غضب کی پروا نہ کی۔ حالانکہ اس عظیم الشان گھر کی عظمت سے وہ اپنے مذہبی صحیفوں کے ذریعہ اچھی طرح واقف تھے۔"[1]

آگے مزید فرماتے ہیں:

"یہ سورہ خدا کی شکر گزاری کا فرض یاد دلانے کی تمہید ہے۔ یعنی اللہ کے مقدس گھر کی برکت سے اہلِ عرب کو عموماً اور اہل مکہ کو خصوصاً عزّت و عظمت اور امن و رزق کی جو نعمتیں حاصل ہیں انھیں یاد دلا کر ان کو شکر گزاری کا فرض یاد دلایا گیا ہے۔ گویا یہ پوری سورہ صرف نعمتوں اور برکتوں کے بیان میں ہے، اس کے بعد کیا ہونا چاہیے اس کا جواب یہ سورہ نہیں دیتی۔ بعد والی سورہ مستقل طور پر اسی سوال کا جواب ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے "فلیعبدوا رب ھذا البیت" (پس چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں)۔"[2]

اس کے بعد سورۂ کوثر کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اگلی سورہ یعنی سورۂ ماعون کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ یہ ان لوگوں کے بیان میں ہے جنھوں نے خانۂ کعبہ کے انتظام میں خیانت کی تھی۔ انھوں نے حج اور اس کے تمام مراسم بگاڑ دیے تھے اور توحید اور غربا پروری کی سنت مٹا کر نماز اور قربانی کی اصل حقیقت باطل کر دی تھی جس کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی اور وہ اس بات کے سزاوار ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دستور کے مطابق یہ نعمت ان سے چھین کر ان لوگوں کے سپرد کر دے جو اس کے اہل ہیں۔"[3]

---

[1] تفسیر نظام القرآن ص ۳۷۲، [2] ایضاً ص ۳۷۲-۳۷۳، [3] ایضاً ص ۴۱۳

آگے وہ مزید فرماتے ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ نے اس سورہ یعنی سورہ کوثر کے ذریعہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی ہے کہ بیت اللہ اور ابراہیم خلیل اللہ اور ان کی اولاد یعنی نسلِ اسماعیلؑ کے مسکن کی تولیت کے لیے خدا نے تم کو اور تمھاری امت کو منتخب کیا۔ اس نسل کے ذریعہ خدا تمام قوموں کو برکت دے گا۔ . . .

یہ عظیم الشان عطیۂ الٰہی یقیناً ایک بہت بڑی کامیابی اور ایک خیر کثیر ہے۔ یہی خیر کثیر اس حوض کوثر کا ضامن ہے جو اللہ تعالیٰ آخرت میں عطا فرمائے گا۔

"ان اعتبارات سے یہ سورہ، سورۂ ماقبل کے بعد اسی طرح آئی ہے جس طرح قرآن میں عذاب کے بعد رحمت، سلب کے بعد بخشش اور ہلاک ہونے والی قوموں کے بعد کامیاب ہونے والی قوموں کا ذکر آیا کرتا ہے۔ یہ اسلوب قرآن مجید میں عام ہے۔

نیز چونکہ سورہ مابعد "سورۂ کافرون" میں جوارِ بیت اللہ سے ہجرت کا اعلان ہے اس وجہ سے نظمِ کلام مقتضی ہوا کہ پہلے بشارت اور تسلّی کی سورہ رکھ دی جائے تاکہ نظمِ قرآن سے ہی یہ واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے رنج سے پہلے راحت کا فیصلہ کر دیا ہے اگرچہ اس کا ظہور بعد میں ہوگا۔ اسی وجہ سے سورۂ کافرون جس میں اعلان ہجرت ہے دو بشارت والی سورتوں یعنی 'سورہ کوثر' اور 'سورہ نصر' کے درمیان رکھی گئی ہے۔

اس کے علاوہ اس سورہ میں آنحضرتؐ کو اس امر کی بھی بشارت دی گئی تھی کہ آپ کی امت زیادہ ہوگی اور آپؐ کے دشمن بیت اللہ کی برکتوں سے محروم ہوں گے۔ اس وجہ سے 'سورۂ کافرون' میں اس محرومی کی اصل علّت واضح کر دی گئی کہ بیت اللہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ توحید الٰہی کا ایک مرکز قائم ہو لیکن جب ان لوگوں نے اس مرکزِ توحید کو شرک کا اڈہ بنا ڈالا تو کوئی وجہ نہیں کہ

اس پر قابض رہیں۔" ؎۱

اس کے بعد سورۂ لہب کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سورہ نصر کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت فتح مکہ پر تمام کی اسی طرح آپ کے صحیفۂ نبوت کو اس فتح عظیم کے ذکر پر ختم کیا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حق اپنے مرکز پر پہونچ گیا۔ کیونکہ کعبہ کے مرکزِ توحید و اسلام ہونے کی وجہ سے فتح مکہ ہی محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کا مرکز تھی۔ اس کے بعد صرف ثبات اور استقامت کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے تین سورتیں اس کے بعد رکھ دی گئیں 'سورۂ اخلاص' جو تمام معارف توحید کا خزانہ ہے، یہ واضح کرنے کے لیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کی غایت توحید ہے، اور معوذتین دعائے استقامت کی تلقین کے لیے۔" ؎۲

آگے مزید فرماتے ہیں:

"اس تمہید سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ تمام سورتیں (سورۂ نصر، سورۂ اخلاص، اور معوذتین) باہم دگر مربوط ہیں۔ اس وجہ سے سورہ لہب کا ان کے درمیان رکھا جانا کسی خاص سبب و حکمت پر ہی مبنی ہو سکتا ہے ورنہ پورا سلسلۂ نظم درہم برہم ہو جائے گا۔ چنانچہ غور و فکر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سورۂ نصر میں جس فتح و غلبہ کا ذکر ہے سورۂ لہب میں اسی فتح و غلبہ کی وضاحت اور بشارت ہے۔ گویا یوں فرمایا گیا کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو غلبہ دیا اور اس کے دشمن کو برباد کیا جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے:

جاء الحق وزهق الباطل	حق نمودار ہوا اور باطل مٹ گیا
ان الباطل کان زهوقاً۔	بلا شبہ باطل کو تو مٹنا ہی تھا۔

اس قسم کے نظم کی نہایت لطیف مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس

؎۱ تفسیر نظام القرآن ص ۴۱۳ - ۴۱۴، ؎۲ ایضاً ص ۴۸۵

خطبے میں بھی ہے جو آپؐ نے فتح مکہ کے موقع پر کعبہ کے دروازے پر دیا تھا۔ ؎۱

یہ سورۂ ہمزہ سے سورۂ ناس تک کی گیارہ عظیم الشان سورتوں کے نظم پر ایک سرسری مگر نہایت عالمانہ اور محققانہ گفتگو ہے۔

اس گفتگو سے نہ صرف یہ کہ یہ تمام سورتیں اسرار و معانی کا ایک نہایت حسین و جمیل اور انتہائی دل آویز گلدستہ معلوم ہوتی ہیں، بلکہ اس کے بعد ان سورتوں کی صحیح تاویل تک پہونچنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ تفسیر قرآن بالقرآن کا وہ زریں اصول ہمارے ساتھ رہتا ہے اور خود قرآن کی روشنی میں وہ بہت ساری گتھیاں سلجھ جاتی ہیں جنھیں سلجھانے میں ایک مفسّر کو دشواریاں پیش آتی ہیں۔

سورتوں کا یہ نظم سامنے آجانے کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ سورۂ کوثر میں 'کوثر' سے مراد خانۂ کعبہ ہے۔ اس لیے کہ اس کا ماحول اسی مفہوم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

سورۂ قریش تو واضح طور پر خانۂ کعبہ کے ہی ذکر پر مشتمل ہے:

فلیعبدوا رب هذا البیت۔	انھیں اس گھر کے رب کی عبادت کرنی چاہیے۔

سورۂ فیل میں لفظوں میں تو خانۂ کعبہ کا ذکر نہیں ہے لیکن ظاہر ہے اس میں جس واقعے کی طرف تلمیح ہے وہ براہ راست خانۂ کعبہ سے ہی متعلق ہے۔

سورۂ ماعون میں بھی گرچہ صراحتاً خانۂ کعبہ کا ذکر نہیں ہے لیکن ان بنیادی صفات کا ذکر موجود ہے جو خانۂ کعبہ کی تأسیس کی روح اور اس کی اصل بنیاد تھیں، یعنی نماز اور کمزوروں کے ساتھ ہمدردی اور مواسات۔

اسی طرح سورۂ نصر میں جس فتح کا ذکر ہے ظاہر ہے اس کا واضح اشارہ فتح مکہ کی طرف ہے، اور فتح مکہ کا مطلب دوسرے لفظوں میں خانۂ کعبہ کا حصول تھا۔

؎۱ تفسیر نظام القرآن ص ۴۸۶

ان سورتوں کا نظم سامنے آجانے کے بعد یہ بات بھی سپیدۂ صبح کی طرح روشن ہوجاتی ہے کہ ان میں سے ہر سورہ کا سببِ نزول یا شانِ نزول یا موقعِ نزول کیا ہے۔ جیسا کہ امام فراہیؒ کی اس گفتگو سے صاف ظاہر ہے جو ابھی ابھی گزری ہے۔

اور یہ بات معلوم ہے کہ آیات کے نظم سے جو سبب نزول یا موقع نزول متعین ہوگا وہ تفسیر قرآن بالقرآن کے ہی حکم میں داخل ہوگا۔

ان سورتوں کا باہمی ربط و نظام سامنے آجانے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ ان میں سے ہر سورہ اپنے بعد والی سورہ کے معنی کی کلید ہے کہ وہ اس کا صحیح رُخ بھی متعین کرتی ہے اور اس کی صحیح تاویل کی طرف بھی رہنمائی کرتی ہے اور اگر یہ ربط و نظام سامنے نہ رہے، تو نہ تو ان سورتوں کا صحیح رُخ متعین کرنا ممکن ہے اور نہ ان کے صحیح مفہوم تک رسائی کا کوئی امکان ہے۔

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک سورہ دوسری سورہ کی تفسیر کرتی اور اس کے قفل معانی کے لیے کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں اس اصول پر پورے قرآن کی تفسیر کی جاسکتی ہے۔

آخر میں اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے کہ تفسیر قرآن بالقرآن کا جب یہ وسیع اور معیاری تصوّر سامنے رہتا ہے تو اس صورت میں قرآن پاک کی ہر آیت اپنے مفہوم و مدلول میں بالکل واضح اور قطعی نظر آتی ہے اور ان تمام کمزور اور غیر واقعی احتمالات کے دروازے بند ہوجاتے ہیں، جن احتمالات کا کوئی مناسب حل نہ پاسکنے کی بنا پر بعض لوگ معنی قرآن کو 'ظنی الدلالہ' کہنے پر مجبور ہوئے اور پھر کسی آیت کے اندر اٹھائے جانے والے بہت سے کمزور اور بے محل احتمالات سے چھٹکارا حاصل کرنے اور صحیح تر مفہوم متعین کرنے کے لیے بے بنیاد روایات تک کا سہارا تلاش کرنے لگے اور اگر کسی مقام پر ان کا سہارا نہ پاسکے تو ان تمام احتمالات کو نہایت بے بسی کے ساتھ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے، اور پھر بعد میں لوگ انہیں احتمالات کی حکایت کو قرآن کی تفسیر سمجھنے لگے۔

امام فراہی کے سامنے چونکہ تفسیر قرآن بالقرآن کا یہ وسیع اور معیاری تصوّر ہمیشہ

واضح رہا اس لیے انھوں نے یہ اعلان کیا کہ پورا قرآن قطعی الدلالہ ہے۔ اور اگر اس کی آیات پر سیاق و سباق اور نظم کلام کی روشنی میں غور کیا جائے تو تمام شبہات و احتمالات کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور ہر آیت کا صحیح مفہوم آفتاب کی طرح روشن ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ کسی آیت کی صحیح تاویل کوئی ایک ہی ہوسکتی ہے، ایک سے زائد نہیں ہوسکتی۔ اور اس ایک صحیح تر تاویل تک رسائی اسی وقت ممکن ہے جب کہ نظم کلام کا سررشتہ ہاتھ میں ہو اور اس آیت کو سیاق و سباق اور اس کے ماحول کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں تفسیرِ قرآن بالقرآن کے زرّیں اصول کو مضبوطی سے اختیار کیا جائے، اُسے ہمیشہ پیشِ نظر رکھا جائے اور صحیح معنوں میں اس کی تطبیق کی جائے۔

یہ ہیں امام فراہیؒ کی پانچ امتیازی خصوصیات، جن کی بنیاد پر انھیں ائمۂ تفسیر کی صف میں جگہ دی گئی ہے۔ وذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔